احمد ندیم قاسمی: معاصرانہ چشمک

پروفیسر فتح محمد ملک

In every era contemporary writers and artists usually have rivalry or professional jealousy called "HUM ASRANA CHUSHMUK" in Urdu. Such rivalry shows individual behavior and also becomes a reference of literary history and collective wisdom of its age as well. This article also unfolds many realities with the reference of Ahmed Nadeem Qasmi, a well known poet and prose writer. These facts .help to understand the personality of Ahmed Nadeem Qasmi too.

ادبیاتِ عالم میں معاصرانہ چشمک کی مثالیں عام ہیں۔ ہمارا ادب بھی اِس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ معاصرانہ چشمک ہمیشہ ادبی شخصیات کی نفسیاتی ساخت پرداخت کا شاخسانہ ہوتی ہے۔ اپنے چند معاصرین کے ساتھ احمد ندیم قاسمی کی چشمک کی جڑیں، بڑی حد تک، اُن کے بچپن اور لڑکپن کے ماحول میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ پیرزادہ احمد شاہ ندیم قاسمی پنجاب کے ایک پسماندہ علاقے کے چھوٹے سے گاؤں انگہ میں، ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے جو پورے علاقے میں مرجعِ خلائق تھا۔ اِس خاندان کے بچوں سے لے کر بزرگوں تک ہر کوئی ہر کسی کی تعظیم و تکریم کا مستحق ٹھہرا تھا۔ مریدان باصفا پیروں کے اِس خاندان کے چھوٹے چھوٹے بچوں تک کی قدم بوسی کو دنیا و آخرت میں اپنی نجات کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ جب احمد ندیم قاسمی اِس ماحول میں پرورش پا کر ادبی دنیا میں ایک نمایاں مقام پر فائز ہوئے تو ذرا سی نکتہ چینی بھی اُنھیں کرب و اضطراب میں مبتلا کر دیتی تھی۔ وہ اِس نکتہ چینی کو نظر انداز کر کے اپنے کام سے کام رکھنے کی بجائے اِس کا جواب دینا یا دلوانا ضروری سمجھتے تھے۔ اُن کی اس عادت نے اُنھیں بسا اوقات کرب و اضطراب میں مبتلا رکھا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے ساتھ اُن کی چپقلش کا سبب بھی اسی حقیقت کا غماز ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کا بچپن اور لڑکپن بھی کچھ ایسے ہی ماحول میں گزرا تھا۔ اُن کی پیدائش اپنے علاقے کے ایک بڑے جاگیردار خاندان میں ہوئی تھی۔ وہ بھی بچپن ہی سے اپنے مزارعین کی جانب سے عزت و احترام کے مستحق چلے آ رہے تھے۔ اُن کے اردگرد بھی ادیبوں، شاعروں اور قلمکاروں کا ایک انتہائی تابعدار حلقہ ہمیشہ سرگرمِ عمل رہا ہے۔ آغا صاحب بھی، ندیم صاحب کی مثال، اپنی شخصیت و فن پر ذرا سی

تنقید پر بھی بر افروختہ ہو جانے کے خوگر تھے۔ ندیم صاحب اور آغا صاحب میں انتہائی خوشگوار دوستانہ مراسم تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے مضمون بعنوان ''اردو نظم میں دھرتی پوجا کی ایک مثال..... میراجی'' پر ''فنون'' میں چند تنقیدی مباحث نے ڈاکٹر صاحب کو ندیم صاحب سے ناراض کر دیا تھا۔ جب میں نے نئی شاعری پر اپنے ایک مضمون میں جاگیردارانہ نشاط کو دھرتی پوجا کے تصور کا سرچشمہ قرار دیا اور ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر عمیق حنفی نے اپنے مفصل مضامین میں دھرتی پوجا کے تصور کو بڑے محکم استدلال کے ساتھ رد کر دیا تو ڈاکٹر وزیر آغا ندیم صاحب سے ناراض ہو گئے۔ پہلے تو انھوں نے ڈاکٹر عمیق حنفی کے مضمون کے جواب میں ایک مفصل مضمون لکھا جسے ندیم صاحب نے بڑے اہتمام کے ساتھ ''فنون'' میں شائع کیا۔ اس کے بعد بھی بحث جاری رہی۔ بحث کے طول پکڑنے پر آغا صاحب ندیم صاحب سے ناراض ہو گئے۔ بہت جلد ڈاکٹر وزیر آغا کے ادبی مزاجین اور ندیم صاحب کے مریدان با صفا بھی اِس بحث میں کود پڑے۔ رفتہ رفتہ یہ بحث ادبی سے زیادہ ذاتی اور بالآخر گالم گلوچ کی شکل اختیار کر گئی۔ یوں سنجیدہ ادبی مکالمے کی بجائے فضولیات نے لے لی۔ ندیم صاحب کے خطوط میں اِس امر کے وافر ثبوت موجود ہیں کہ اپنے اپنے عقیدت مندوں سے الگ جب کبھی دونوں کی ملاقات ہوئی تو فضا اچانک بہت خوشگوار ہو گئی اور دونوں نے یہ محسوس کیا جیسے اُن کے درمیان کبھی کوئی تلخی پیدا ہی نہ ہوئی تھی۔ پھر جب ہر دو زعما اپنے اپنے حلقۂ یاراں میں اسیر ہو کر رہ جاتے تو کشیدگی کی فضا بحال ہو جاتی۔ فیض اور ندیم کے درمیان معاصرانہ چشمک میں بھی کچھ ایسی ہی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ ندیم اور فیض جہاں بھی اکٹھے ہوئے رقابت اچانک رفاقت میں تبدیل ہو گئی۔

ندیم صاحب کی کتاب ''میرے ہم سفر'' میں فیض احمد فیض کی شخصیت پر جو مضمون شامل ہے وہ پہلے پہل عطاء الحق قاسمی کے مؤقر جریدہ ''معاصر'' میں شائع ہوا تھا۔ اِس مضمون کو سرسری انداز سے پڑھنے والا بھی اِس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ندیم صاحب کا یہ مضمون ہجو ملیح کی ایک مثال ہے۔ اِس مضمون میں علاوہ اور بہت سی غیر اہم باتوں کے اِس حقیقت سے بھی غلط نتائج اخذ کیے گئے ہیں کہ فیض احمد فیض دوسری عالمی جنگ کے دوران برٹش انڈین آرمی کے شعبۂ تعلقاتِ عامہ میں کرنل کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے رہے تھے اور ان خدمات کے عوض انھیں ممبر آف برٹش ایمپائر کا اعزاز بھی ملا تھا۔ میں نے ''معاصر'' ہی کے اگلے شمارے میں اپنے مضمون بعنوان ''فیض، فاشزم اور مہاتما گاندھی'' میں فیض کے اِس مؤقف کی تصدیق کی تھی کہ وہ فی الحقیقت فاشزم کے خلاف جنگ میں شریک رہے تھے۔ میں نے اِس ضمن میں فیض کی نظم ''سیاسی لیڈر کے نام'' کا حوالہ دیا تھا جس میں فیض نے مہاتما گاندھی کو اُن کی فاشزم دوستی کے ہولناک نتائج سے یوں خبردار کیا تھا:

سالہا سال یہ بے آسرا جکڑے ہوئے ہاتھ
رات کے سخت و سیہ سینے میں پیوست رہے
جس طرح تنکا سمندر سے ہو سرگرمِ ستیز
جس طرح تیتری کہسار پہ یلغار کرے
اور اب رات کے سنگین و سیہ سینے میں
اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے

جا بجا نُور نے اک جال سا بُن رکھا ہے
دُور سے صبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے
تیرا سرمایہ تیری آس یہی ہاتھ تو ہیں
اور کچھ بھی تو نہیں پاس، یہی ہاتھ تو ہیں
تجھ کو منظور نہیں غلبۂ ظلمت ، لیکن
تجھ کو منظور ہے یہ ہاتھ قلم ہو جائیں
اور مشرق کی کمیں گہ میں دھڑکتا ہوا دن
رات کی آہنی میّت کے تلے دب جائے!

میرا یہ استدلال ندیم صاحب کو پسند نہ آیا۔ چنانچہ انھوں نے لکھا کہ: ''آپ نے فیض صاحب کی کرنیلی اور ''ممبر آف برٹش ایمپائر'' کے خطاب کے حوالے سے ان کا غلط اور دور از کار دفاع کیا اور اگر آپ اب تک بضد ہیں کہ آپ نے سچ بولا تو اِس سچ کے پاؤں کہاں ہیں؟ دراصل جب فیض صاحب نے دیکھا کہ تحریک پاکستان تو کامیابی کی طرف گامزن ہے تو انہوں نے ''پاکستان ٹائمز'' کی نہایت عزت بخش اور دولت بخش ادارت قبول کر لی اور یوں انہوں نے گاندھی کے پیشتروں سے چونکنے کی بجائے بباطن قائداعظم کی قیادت سے اطمینان محسوس کیا۔ ''پاکستان ٹائمز'' کے مدیر کی تنخواہ، اُس دَور کے حوالے سے، انگریزی روزنامے کے بھی ایڈیٹروں سے زیادہ تھی (اور آپ کے اس عاجز اور درویش بھائی نے، جب ۱۹۵۳ء میں ''امروز'' کی ادارت قبول کی، تو اس کی تنخواہ تین سو روپے ماہانہ تھی) انگریزی روزنامے کی ادارت کی شان و شوکت کے علاوہ اس طرح اُنھیں میاں افتخار الدین اور میاں محمود علی قصوری اور دیگر متعدد اہلِ اثر اور اہلِ زر لوگوں کا قرب حاصل ہونے کا بھی فائدہ تھا۔ چنانچہ فیض صاحب نے اپنے مفاد کو ترجیح دی اور یہ کوئی بری بات نہیں تھی۔ آپ کرنیلی کے عہدے سے فیض صاحب کی علیحدگی کو اُن کا ایثار قرار دے رہے ہیں، جبکہ آپ سے بہتر کون جانتا ہے کہ جب آزادی صاف نظر آ رہی تھی تو ملک فیروز خان نون تک تحریک پاکستان میں شامل ہو گئے تھے، اور فیض نے اگر اُس موقعے پر ایک بڑے ادارے کے ایک بڑے روزنامے کی ادارت قبول کی تھی تو یہ ادارت ملک کی صدارت کے برابر کا اعزاز تھا۔ آپ نے تو ان کے کرنیلی تج کر ایڈیٹری اختیار کرنے کا یوں ذکر کیا ہے جیسے انہوں نے بادشاہت سے دستکش ہو کر کسی مزار کی مجاوری قبول فرمائی تھی۔۔۔۔۔ سو میرے عزیز بھائی۔ سچ یقیناً لکھیے مگر اپنے تعصبات کو سچ کا خوبصورت نام دینے سے گریز کیجیے۔ یعنی محض اپنی پسند کا سچ لکھنے سے گریز فرمائیے۔ سچ کوئی ڈھیلی ڈھالی چیز نہیں ہوتا۔ سچ اور حق کے معیاروں کو سبھی کے لیے یکساں ہونا چاہیے کہ سچ اور حق پر کسی کا اجارہ نہیں ہے۔ میں نے فیض صاحب پر (اور اس سے پہلے منٹو صاحب پر اور راشد صاحب پر اور مولانا مہر پر اور مولانا سالک وغیرہ وغیرہ پر) مضمون لکھ کر سچ اور حق ہی کا بول بالا کیا ہے۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ فیض کے اِکا دُکا بونگس اور جاہل ساتھیوں نے میرے مضمون کے حوالے سے مجھ پر جو غلاظت اچھالی تھی، اس کا جواب تو آپ کیا دیتے (ورنہ یہ آپ کا فرض تو بنتا ہی تھا) اُلٹا اِس نازک موقعے پر آپ اُن جاہلوں کی بالواسطہ حمایت پر اُتر آئے اور بیشتر پڑھے لکھے لوگ آپ کی اس قلابازی پر (جسے آپ سچ قرار دے رہے ہیں) دم بخود رہ گئے کہ کیا یوں بھی ہو سکتا ہے!!! بہر حال، میرے بہت پیارے بھائی، منصور حلاج پر پتھر برس رہے تھے تو وہ چپ چاپ سہتا رہا، مگر

جب اس کے دوست شبلی نے اس پر ایک پھول پھینکا تو منصور درد سے بلبلا اُٹھا.....آپ نے تو مجھے دوسروں کی طرح سچ مچ کا پتھر ہی دے مارا۔[1]" اللہ جانتا ہے کہ میں نے تو نیک نیتی کے ساتھ ایک تنقیدی تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی تھی مگر ندیم صاحب نے میری اس حقیر تحریر کی تعبیر جس انداز میں کی وہ میرے لیے انتہائی تکلیف دہ تھی۔ اس پر مستزاد ان کا درج ذیل خط:

"میرے پیارے بھائی، سلام محبت

"معاصر" کے بعد 'آثار' میں آپ کا وہی مضمون دیکھا، تو اندازہ ہوا کہ آپ کی نظر میں اس کی کتنی اہمیت ہے۔ ملک میں پانچ چھ معیاری ادبی جریدے اور بھی موجود ہیں۔ وہ اس گراں بہا تحریر سے کیوں محروم رہیں۔ توجہ فرمایئے۔

آپ کی صحت اور خوشحالی کے لیے دُعا گو آپ کا بھائی، احمد ندیم قاسمی [2]"

امر واقعہ یہ ہے کہ متعدد ادبی جرائد نے میرا یہ مضمون مجھ سے پوچھے بغیر "معاصر" کے حوالے سے شائع کر دیا تھا۔ فیض صاحب پر ندیم صاحب کے مضمون اور ادبی حلقوں میں اُس مضمون پر ردِ عمل نے جلد ہی ناگفتہ بہ صورتِ حال پیدا کر دی تھی۔ اِس سلسلے میں فیض کی برسی پر منعقدہ مشاعرے میں ندیم صاحب کے ساتھ بدسلوکی کے گھناؤنے واقعے کا ذکر خود ندیم صاحب کی زبانِ قلم سے سنیئے:

"آپ کے پاکستان آنے سے پہلے یہاں فیض صاحب کی برسی پر "فیض میلہ" منعقد ہوا تھا۔ فیض صاحب کی ایک صاحبزادی میری طرف لپکیں اور معافیاں مانگنے لگیں مگر میں نے کہا کہ آپ لوگوں کا کیا قصور ہے یہ تو میرے الٹرا لفٹسٹ دوستوں کا کیا دھرا ہے جن کے ساتھ میں نے اپنی زندگی برباد کی۔ پھر ظہیر باہر بھاگا آیا..........اس خوف سے کہ کہیں مجھ پر حملہ نہ ہو جائے۔ کچھ دیر کے بعد قتیل شفائی صاحب بھی اُٹھ آئے اور مجھ سے آملے (میں ان کا بے حد ممنون ہوں) ان کے ساتھ فارغ بخاری بھی تھے مگر وہ محض اس لیے تھے کہ وہ قتیل کے ہاں رُکے ہوئے تھے ورنہ بعد میں انہوں نے مجھے پشاور سے جو خط لکھا اس میں تحریر کیا کہ..........'امید ہے آپ آئندہ محتاط رہیں گے!"..........چار روز بعد بیگم فیض نے فون پر کہا کہ:

I am very sorry for the incident and after some days I will invite you to come to my house and recite your poetry!

جیسے میں نظمیں سنانے کے لیے بے چین ہوں! بہر حال میں نے ان کا شکریہ ادا کر دیا۔ اس کے بعد قومی پریس نے جس حیرت انگیز یک جہتی کے ساتھ اس واقعے کی مذمت کی اور لفٹ رائٹ کی تمیز اُٹھا کر مجھ سے اظہارِ ہمدردی کیا، وہ میرا بڑا سہارا ثابت ہوا۔ بہر صورت خود آکر مجھے مدعو کر گئیں۔ مگر (آپ نے سن لیا ہوگا) کہ مشاعرہ گاہ میں میرے ساتھ انتہا درجے کی بدسلوکی ہوئی۔ جونہی میرے نام کا اعلان ہوا، حاضرین کے ایک حصے سے 'نہیں سنیں گے نہیں سنیں گے" کا شور بلند ہوا پھر جو آوازے کسے گئے وہ اس قسم کے تھے کہ:

جنرل عارف کے مدح خواں کو نہیں سنیں گے۔

فوجی جرنیلوں کے خوشامدی کو نہیں سنیں گے۔

فیض کے بدخواہ کو نہیں سنیں گے۔

اہلِ قلم کانفرنسوں میں شامل ہونے والے کو نہیں سنیں گے......وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب کچھ ہندوستان سے آئے ہوئے علی سردار جعفری اور مجروح سلطانپوری اور کیفی اعظمی کے سامنے ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مشاعرے کی کمپیئر کشور ناہید صاحبہ کو اس کا پیشگی علم تھا۔ صدارت بیگم فیض کی تھی۔ وہ حاضرین میں بیٹھی تھیں۔ اگر وہ اٹھ کر ہاتھ بلند کر دیتیں تو سب خاموش ہو جاتے، مگر وہ بھی چپ چاپ بیٹھی رہیں۔ میری زندگی میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ مجھے مکمل طور پر ہُوٹ کیا گیا تھا۔(۳)"

'اس شرمناک واقعے کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔ اِس غنڈہ گردی کے مرتکب افراد سے ندیم صاحب کی رنجیدگی قابلِ فہم ہے مگر تقریب میں شامل چند شخصیات کے بارے میں اُن کا منفی تاثر نا قابلِ فہم ہے۔ کشور ناہید ہو یا منّو بھائی یا کوئی اور شاعر، اِن کے مشاعرے سے واک آؤٹ نہ کرنے میں فیض صاحب کا احترام بھی حائل ہو سکتا ہے۔ یہ مشاعرہ فیض صاحب کی برسی کی تقریب پر منعقد ہوا تھا۔ شاید محمود ندیم کے سے چند غیر ادب "ہلڑ بازوں کو چھوڑ کر باقی ماندہ لوگ فیض اور ندیم ہر دو کے عقیدت مند تھے۔ ممکن ہے کہ یہ خواتین و حضرات فیض صاحب کے احترام میں بیٹھے رہے ہوں۔ بعد ازاں جب میں نے اپنا مضمون بعنوان ''کشور ناہید کی داستانِ محبت'' ''فنون'' میں اشاعت کے لیے بھیجا تو اُس پر ندیم صاحب کا ردِ عمل پڑھ کر حیرت میں گم ہو گیا۔ لکھا تھا کہ:

''میں بہت خوش ہوا تھا کہ بھاری لفافہ ہے اس میں ضرور کوئی مضمون ہو گا اور مدتوں کے بعد آپ کا قفلِ خاموشی ٹوٹے گا، مگر مضمون کا عنوان پڑھ کر لرز گیا۔ خدارا محسوس نہ کیجیے گا، مگر یہ ضرور عرض کروں گا کہ آپ نے ایک غیر شاعرہ کی شاعری کی اتنی بھرپور داد دے کر زیادتی کی ہے۔ اس شاعرہ کا کوئی ایک بھی مصرع گٹھا ہوا نہیں ہوتا اور شاید اسی لیے نثری شاعری میں اس نے پناہ ڈھونڈی ہے۔ وہ ادا جعفری یا پروین شاکر یا منصورہ احمد کی سی ایک لائن تک لکھنے کی قدرت نہیں رکھتی۔ ساتھ ہی اس کی اور بھی متعدد 'خدمات'' ہیں۔ وہ مسلمہ طور پر ڈبل ایجنٹ ہے اور یہی وجہ ہے کہ اتنے Delicate محکمے میں بھی اسے مارشل لاء کے دنوں میں بھی باعزت طور پر بحال رکھا گیا ہے۔ پھر شاید آپ اپنی شرافتِ طبعی کی وجہ سے یہ حقیقت بھی بھول بیٹھے ہیں کہ اسی نے آپ کی کتاب ''تعقبات'' کی رسمِ افتتاح کو خراب کرنے کی کوشش کی تھی۔ نیشنل سنٹر میں وہ اجتماع آپ کو یاد ہو گا جب اس کے ایک پڑھائے سکھائے آدمی نے آپ کے خلاف (اور ضمناً میرے خلاف بھی) بکواس کی تھی اور صرف پروفیسر محمد عثمان (مرحوم) کی غیرت نے جوش کھایا تھا اور انہوں نے اسٹیج پر آپ کو defend اور معترض کو رد کیا تھا۔ اور یہ ساری سازش آپ کے خلاف اسی مردود شخصیت نے تیار کی تھی۔ اس کے بعد فیض کی پہلی برسی پر، فیض کے نام پر برپا ہونے والے ''امن میلہ'' کے مشاعرے میں آٹھ دس ہزار سامعین اور بھارت کے تین چار معزز شاعروں کی موجودگی میں اس نے مجھے ''ہُوٹ'' کرایا اور میری پوری ادبی زندگی میں 'ہُوٹ'' ہونے کا یہ پہلا حادثہ تھا۔ اسی نے اپنے کارندوں کو مقرر کیا تھا کہ جب میرا نام پکارا جائے تو ''نہیں سنیں گے، نہیں سنیں گے'' اور ''ضیاء الحق کا کارندہ'' اور ''مارشل لا کا

قصیدہ خواں" اور "جنرل عارف کا دستِ راست" وغیرہ کی رٹ لگا دی جائے۔ اور یوں میں اس بہت بڑے اجتماع میں سے بے عزت ہو کر نکلا۔ اس پر لاہور اور کراچی کے بھی اخبارات نے میرے حق میں بھرپور کالم لکھے اور اس شاعرہ کی نشان دہی بھی کر دی۔ منو بھائی بھی مشاعرے میں موجود تھے مگر ان کو یا کسی بھی شاعر کو توفیق نہ ہوئی کہ جب میں اوپن ایئر تھیٹر کی سیڑھیاں اتر رہا تھا تو وہ بھی اتر آتے۔ منو بھائی نے کالم لکھا کہ جب ندیم سیڑھیاں اتر رہے تھے تو میں نے فیض کو بھی ان کے ساتھ اُترتے دیکھا تھا۔ اس پر منصورہ بیٹی نے منو بھائی کو لکھا تھا کہ کاش ندیم اور فیض کے ساتھ منو بھائی بھی یہ سیڑھیاں اُترتے دکھائی دیتے! بہر حال یہ شاعرہ اب ڈبل ایجنٹی کا کمایا کھا رہی ہے اور اسلام آباد میں بہت ہی بڑی پوسٹ کے مزے لوٹ رہی ہے۔
ایسی شخصیت پر آپ کا تحسینی مضمون خود آپ کے لیے بھی مضر ہو سکتا ہے کہ وہ اتنی بھرپور داد و تحسین کی کسی صورت میں مستحق نہیں ہے۔ بہر حال میرے پاس یہ مضمون محفوظ رکھا ہے۔ جو آپ کا حکم ہوگا اس کی تعمیل ہوگی۔ اگر اس کا چھپوانا ضروری ہو تو میری رہنمائی کیجیے کہ کسے بھجوا دوں۔ مگر میں یہی عرض کروں گا کہ اسے رہنے ہی دیجیے۔ میں آپ کے ردِ عمل کا منتظر رہوں گا۔ (۴)"

یہاں یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ کشور ناہید کی شخصیت و کردار کے بارے میں ندیم صاحب کا یہ محاکمہ تکلیف دہ حد تک غیر منصفانہ ہے۔ متعلقہ سطور پڑھتے وقت مجھے بے اختیار وہ لمحات یاد آ رہے تھے جب ندیم صاحب اپنے گردے میں پتھری کے سلسلے میں لاہور کے ایک کلینک میں داخل تھے اور کشور ناہید عیادت کے لیے آنے والوں میں بیٹھی زار و قطار رو رہی تھیں۔ کشور کے بارے میں اُن کی یہ بدگمانی مجھے بلا جواز نظر آتی ہے۔ مسعود اشعر نے ندیم صاحب کی وفات پر اپنے مضمون بعنوان "آخری ملاقات" میں بھی اِس سلسلے میں کشور ناہید کو بے قصور ٹھہرایا ہے۔ (۵) مجھے یقین ہے کہ اگر فیض اِس دنیا میں ہوتے تو اُن چند ایسے غیر کمیونسٹ ترقی پسندوں کے اِس احتجاج کو سخت ناپسند کرتے جو اُنھوں نے ندیم صاحب کی ترقی پسندی کی مسلمان شناخت کے خلاف کیا تھا۔ میں جب بھی ندیم صاحب کی اِس تلخی کا موجب کا خیال کرتا ہوں تو میری زبان پر اقبال کا یہ مصرع رواں ہو جاتا ہے:

؎ اُس کی نفرت بھی عمیق اُس کی محبت بھی عمیق!

حواشی و حوالہ جات

(۱) خط مورخہ ۲۲ ستمبر ۲۰۰۱ء صفحات ۸۶۔۸۷
(۲) ایضاً، صفحہ ۹۸
(۳) ایضاً، صفحات ۸۹۔۹۰
(۴) ایضاً، صفحات: ۹۳۔۹۴
(۵) سونتاج، لاہور ۲۰۰۷ء صفحات ۴۴۔۴۵